ملّی انتشار کے دینی تقاضے

نظمِ اجتماعی کی بحالی کی ضرورت

امّتِ مسلمہ کے لئے ایک منظم اجتماعی زندگی، جس حد تک ضروری ہے اور جس لئے ضروری ہے، پچھلے مباحث نے ہم پر یہ بات پوری طرح واضح کردی ہے لیکن اس دنیا میں کوئی گروہ ہمیشہ اپنی مطلوبہ حالت ہی میں باقی و کارفرما نہیں پایا گیا ہے۔ اس لئے یہ ملّت بھی ایسے حالات سے دوچار ہوسکتی ہے جب وہ اپنی اس ضروری ہیئت اجتماعیہ سے محروم ہوچکی ہو جب وہ ایک منظم اور منضبط جماعت رہنے کے بجائے افراد کی بس ایک بھیڑ بن گئی ہو جمیں نہ کوئی شیرازہ بندی ہو نہ کوئی اجتماعی حرکت ہو، اور اس لئے عملاً اس کا وہ مقصد بھی باقی نہ رہ گیا ہو جس کے لئے وہ وجود میں آئی تھی ـــــــ جیساکہ آج ایک مدت سے اس کا یہی حال فی الواقع ہو بھی چکا ہے ـــــــ ایسی صورتِ حال کے بارے میں یہ کہنا کہ اسلام کے نزدیک وہ سخت ناپسندیدہ بلکہ ناقابلِ برداشت ہے، ایک غیر ضروری بات ہوگی، کیونکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا، لیکن اسی صورتِ حال کے بارے میں یہ بات، کہ پھر اس شکل میں افرادِ ملّت کو کرنا کیا چاہیئے، اتنی واضح اور روشن نہیں ہے، اس لئے نظری اور عملی، ہر حیثیت سے ضروری ہے کہ اس اہم ترین سوال کا صحیح جواب معلوم کیا جائے۔

پہلے اس سوال کا عقلی جواب متعین کیجئے:۔

اوپر کے سارے مباحث ہمارے سامنے ہیں۔ ان مباحث میں ہم دیکھتے ہیں کہ اجتماعیت ـــــ انتہائی ٹھوس، منظم اور منضبط اجتماعیت ـــــ اسلام کے لئے فطرۃً مطلوب اور عملاً ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر نہ امت مسلمہ، امتِ مسلمہ بن کر رہ سکتی ہے، نہ اسلام نوع انسانی کو وہ سب کچھ دے سکتا ہے، جسے دینے کیلئے وہ آیا ہے۔ اس کے بے شمار احکام جن کا تعلق انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل تک سے ہے۔ صرف کتابت اور تلاوت کے لئے وقف ہو کر رہ جاتے ہیں اور عملی دنیا میں انکے نافذ اور قابل اتباع ہونیکی کوئی شکل بن ہی نہیں سکتی۔ یہ سب کچھ ہم واضح اور قطعی دلائل کی روشنی میں دیکھ چکے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ عقل ان ساری باتوں کا تقاضا کیا ٹھہراتی ہے؟ یہی، یا اسکے سوا کچھ اور؟ کہ یہ ملت پھر سے پھر "جماعت" بنے، ایسی جماعت جسمیں نظم و اتحاد ہو، یک رنگی و یک حرکتی ہو اور جسے "الجماعۃ" کہہ سکیں، اور جو اپنے مقصد وجود کو پورا کرنے کے قابل ہو سکے؟ کوئی شک نہیں کہ عقل کا فیصلہ اور تقاضا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد اس سوال کا شرعی جواب معلوم کیجئے اور یہی جواب فی الواقع اصل جواب ہوگا:۔

اس غرض سے ہم جب کتاب الٰہی اور سنت رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو ہمارے سامنے سب سے پہلے قرآنِ حکیم کی یہ ہدایتیں آتی ہیں:۔

یا ایھا الذین آمنوا......	"اے ایمان والو! ...... اللہ کی
واعتصموا بحبل اللہ جمیعا	رسی کو تم سب کے سب مضبوط،
ولا تفرقوا۔ (آل عمران)	پکڑ لو اور علیحدہ علیحدہ نہ رہو۔"
یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا	"اے ایمان والو! (اللہ اور رسول
فی السلم کافۃ (بقرہ)	کی) اطاعت میں تم سب کے سب داخل رہو۔"

پہلی آیت کا منشا، زیر بحث مسئلہ کے خصوص میں بالکل واضح ہے۔ وہ براہ راست یہی ہدایت دیتی ہے کہ سارے مسلمانوں کو متحد و منظم رہنا چاہیے اور ضروری ہے کہ اللہ کی رسی، انھیں باہم مضبوطی سے جوڑے ہوئے ہو۔ رہی دوسری آیت، تو بالواسطہ وہ بھی اس فریضے کی تلقین کر رہی ہے کیونکہ ایک ایک فردِ مسلم کا اللہ اور رسولؐ کی کلی اور غیر مشروط اطاعت میں اپنے آپ کو دیدینا، اس بات کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہنے دے سکتا کہ ملت پھر بھی غیر منظم حالت میں رہ جائے۔ سارے کے سارے مسلمان اگر دینِ حق کو اپنی زندگیاں حوالہ کر دیں ___ اس دینِ حق کو، جو معاشرے کیلئے ایک منظم جماعتی زندگی گذارنا ضروری قرار دیتا اور اس کے لئے سمع و طاعت کے تفصیلی احکام دیتا ہے ___ تو اس کا حاصل لازمًا یہی ہوگا کہ مسلم معاشرہ "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" بن جائے۔ اس لئے آیت کا منشا بالواسطہ یہ بھی ہے کہ ملت اگر پوری طرح متحد و یک رنگ نہ ہو تو لازمًا متحد و یک رنگ ہو جائے۔

یہ ہدایتیں عام اور ہمہ گیر ہدایتیں ہیں۔ یہ کسی خاص حالت، یا کسی خاص وقت یا کسی خاص مقام و ماحول کے لئے کسی طرح بھی مخصوص نہیں۔ جب بھی اور جہاں کہیں بھی مسلمانوں کا کوئی چھوٹا یا بڑا گروہ موجود ہوگا۔ وہ ان ہدایات کا مخاطب ہوگا اور ضروری ہوگا کہ وہ انھیں سنے اور اپنے مقدور بھر ان پر عمل کرے۔ ان آیتوں کے اندر کوئی معمولی سا بھی قرینہ ایسا نہیں جس سے یہ خیال کیا جا سکتا ہو کہ یہ ہدایتیں صرف صحابہ کرام کے لئے تھیں۔ اس لئے ان احکامِ خداوندی کے مخاطب و مکلف ہر دور کے مسلمان ہوں گے چاہے وہ پہلی صدی ہجری کے مسلمان ہوں جب کہ امتِ مسلمہ "حبل اللہ" کے شیرازے میں پوری طرح کسی بندھی تھی، چاہے اس چودھویں صدی ہجری کے مسلمان ہوں جب کہ اس شیرازے کی دھجیاں اڑ چکی ہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو ان احکام کا خطاب جتنی اہمیت اور شدت کے ساتھ اس دورِ نظم و اتحاد کے مسلمانوں سے تھا، اس سے کہیں زیادہ اہمیت اور شدت

کے ساتھ اس دورِ افتراق و انتشار کے مسلمانوں سے ہوگا۔ کیونکہ ان احکام کی عملی حیثیت و اہمیت ان کے لئے تو فی الواقع ایک تلقینِ احتیاط سے کچھ ہی زیادہ تھی، جب کہ اِن کے لئے حکم اور وصیت سے بھی بہت زیادہ ہوچکی ہے۔ ایک نڈھال مریض کے لئے تندرست آدمیوں کے مقابلے میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا لحاظ بہرحال کہیں زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

کلام اللہ کے بعد کلامِ رسول کی طرف آئیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ملی اختلاف و انتشار کی حالت کا براہِ راست تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

من یعش منکم بعد نسیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا وعضوا علیھا با النواجذ۔	"جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ امت میں بہت سارے اختلافات برپا ہوتے دیکھیں گے۔ ایسے وقت میں تمہارے لئے ضروری ہوگا کہ "میری سنت" اور میرے برسرِ ہدایت اور پیروِ حق "خلفاء کی سنت"، کو مضبوطی سے تھامے اور دانتوں سے پکڑے رہو۔"
(ابوداؤد، جلد دوم)	

ہادئ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک جامع اور اصولی ہدایت ہے۔ یہ ایک ایک مسلمان کا شانہ پکڑ کر تلقین کرتی ہے کہ دیکھو، امت میں جب بھی اور جس طرح کا بھی کوئی اختلاف رونما ہو اس وقت "رسولِ خدا کی سنت" اور "خلفائے راشدین کی سنت" پر مضبوطی سے جم جانا، ورنہ اس کے سوا کوئی روش نہ ہوگی جو تمہارے لئے صحیح ایمانی روش کہی جاسکے۔

اس حدیث میں "سنت" کے لفظ کا مفہوم کیا ہے؟ پہلے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ یہاں اس لفظ کا وہ محدود مفہوم نہیں ہے جو ایک فقہی اصطلاح کی حیثیت سے اس کا ہوا کرتا ہے اور جو عام طور سے معروف و متعارف ہے۔ اس حقیقت کی سب سے واضح دلیل خود اسی حدیث کے لفظوں میں موجود ہے۔ اس حدیث میں صرف علیکم بسنتی "کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ" وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین" کے الفاظ بھی ہیں۔ یعنی اختلافات کے وقت" سنتِ رسول" کے ساتھ ساتھ" خلفائے راشدین کی سنت" کو بھی دانتوں سے پکڑنے اور پکڑے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فقہی اصطلاح میں جس چیز کو سنت کہتے ہیں، اس کا اطلاق صرف انہی باتوں پر ہو سکتا ہے جن کا تعلق رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال سے ہو، نہ کہ ان باتوں پر بھی جن کا تعلق اصلاً خلفائے راشدین یا کسی اور صحابی کے اقوال و اعمال اور اجتہادات سے ہو۔ اس لئے اس حدیث میں" سنت" کا وہی وسیع مفہوم ہے جو ازروئے لغت اس لفظ کا ہونا چاہیئے۔ یعنی طریقہ اور روش، جیسا کہ بے شمار حدیثوں میں یہی مفہوم اس لفظ کا لیا گیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں جب بھی اس لفظ کو استعمال فرمایا ہے، اکثر و بیشتر اسی معنی و مفہوم میں استعمال فرمایا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت نبی کے، اور خلفائے راشدین نے بحیثیت خلفائے راشدین کے، زندگی کے جس معاملے میں بھی جو کچھ کیا ہے وہ سب آپؐ کی اور حضرات خلفائے راشدین کی" سنت" ہے۔ خواہ اسکا تعلق عبادتی، امورِ معاشرتی آداب اور تمدنی طور طریقوں سے ہو۔ خواہ سیاست و اجتماع کے وسیع تر مسائل سے۔

اس وضاحت کی روشنی میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعا یہی قرار پائے گا کہ میں تمہارے سامنے دین کی پیروی، اس کی اقامت اور اس کے جملہ تقاضوں کی انجام دہی کے

سلسلے میں جو کچھ کر رہا ہوں اور میرے بعد میری ہی پیروی میں خلفائے راشدین جو کچھ کریں گے تمہارا فرض ہوگا کہ تم بھی وہی کچھ کرنا۔ خصوصاً جب امت میں اختلافات سر اٹھائیں، اسوقت تو اس امر کی ضرورت اور شدید ہو جائے گی۔

غور فرمائیے، امت کا اجتماعیت سے محروم ہو رہنا کون سی حالت ہے؟ کیا یہ حالت اختلاف نہیں؟ بلاشبہ یہ حالت اختلاف ہی نہیں، بلکہ اس سے بھی آگے کی حالت ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس کے اظہار و بیان کے لئے اگر کوئی تعبیر موزوں ہو سکتی ہے تو صرف یہی کہ بیشمار اختلافات کی پیدا کی ہوئی آخری بد ترین حالت ہے۔ اس لئے اگر کسی ایک اختلاف کے رونما ہو جانے پر آپؐ کی اور آپؐ کے خلفائے راشدین کی، سنت" کو دانتوں سے پکڑ لینا ضروری ہے تو بے شمار اختلافات کا بدترین نتیجہ سامنے آ چکنے پر اس ہدایت کی پیروی یقیناً ضروری سے ضروری تر ہو جائے گی ـــ اب آئیے کہ دیکھیں کہ آنحضرت صلعم کی اور آپ کے خلفائے راشدین کی سنت اس طرح کے کسی معاملے میں کیا رہی ہے؟ یا کم از کم یہ کہ اصولاً کیا ہو سکتی تھی؟

اس سلسلے میں جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپؐ کے خلفائے راشدین کی کوئی ایسی سنت اور طریقہ کار تو ہم پا ہی نہیں سکتے جس کا، ملی پراگندگی کی حالت سے راست کا تعلق ہو۔ کیونکہ آپؐ کے مبارک دور میں اس نامبارک حالت کے پائے جانے کا کوئی عملی امکان تھا ہی نہیں۔ اس لئے آپؐ کے اسوے اور آپؐ کی ' سنت ' میں اس بات کی تلاش بھی بے وجہ فضول ہی ہوگی کہ ملی انتشار اور بے نظمی کی کسی حالت میں آپؐ نے کیا کیا تھا؟ آپؐ کا سارا کام صرف ایک نئی امت کی تشکیل تھا۔ اس لئے ملی انتشار کے مواقع کے لئے ہمیں جو رہنمائی مل سکتی ہے وہ آپ کے اسی اسوے اور طریق کار سے ماخوذ رہنمائی ہی ہو سکتی ہے۔ لہذا اس غرض کے لئے بھی ہمیں صرف یہی دیکھنا ہوگا کہ امت کی تشکیل آپؐ نے کس طرح کی تھی؟ پھر جو کچھ، اور جیسا کچھ آپ کو ہم اس سلسلے

ہیں کرنا ہوا پائیں گے۔ اسی سے اُمت کی تنظیم جدید کے لئے بھی کسب ہدایت کریں گے، اور یہی حالتِ اختلاف میں آپ کی 'سنت' کو مضبوطی سے پکڑنا ہوگا۔ یہ بات کہ آپؐ نے امت کی تشکیل کس طرح کی تھی، کسی تفصیلی تعارف کی محتاج نہیں۔ ہر واقفِ حال جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسی بات کو کافی قرار نہیں دے لیا تھا کہ لوگ لاالٰہ الا اللہ کا اقرار کرلیں اور پھر اپنے اپنے طور پر نماز روزہ ادا کرتے ہیں، بلکہ آپ کی دعوت کے لوازم و مضمرات اس سے بہت آگے تک کے تھے۔ آپؐ نے واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا کا جو مفہوم اپنے عمل سے قرار دیا تھا یہ تھا کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرتا، اس کی زندگی آپ سے آپ ایک تنظیم کا جزو بن جاتی اور آپ ایسے تمام افراد کو اجتماعیت کے رشتے میں اس طرح پروتے جاتے جس طرح تسبیح کے دانے پروئے جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ مدنی دور کے کئی برسوں تک اسلام لانے والوں کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ آجائیں۔ گویا ذہنی اور عملی طور ہی پر ان کا ایک منظم گروہ بنتے جانا کافی نہ تھا، بلکہ حالات کے تحت اس وقت ظاہری اور جسمانی طور پر بھی ان کا ایک محاذ پر آکر جمع ہوجانا تقاضائے دین و ایمان تھا۔ یہ حکم آپؐ نے اس وقت تک واپس نہیں لیا جب تک کہ اسلام سیاسی طور پر پوری طرح مضبوط نہ ہوگیا اور اس بات کا کوئی واقعی خطرہ باقی نہ رہ گیا کہ کفر و شرک کی طاقتیں اس کے قیام میں مانع آسکتی ہے۔ فتح مکہ کے بعد جب حالات اس طرح کے ہوگئے، تب جاکر آپؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ اب کسی شخص کو اپنے وطن سے منتقل ہوکر مدینہ آنے کی ضرورت نہیں رہی، جو جہاں ہو وہیں رہ کر نظامِ ملی کا جزو بن کر رہے اور اپنے انفرادی مسائل کے ساتھ اجتماعی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہوتا رہے۔ (لا ھجرۃ بعد الفتح)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریق کار کو سامنے رکھ کر قیاس یہی کیا جاسکتا ہے کہ

اگر آپ کو ملی افتراق و انتشار کی کسی حالت سے سابقہ پیش آیا ہوتا تو آپ صلعم کی سنت، اس وقت بھی یہی ہوتی۔ یعنی آپ اس حالتِ انتشار کو حالتِ نظم و اتحاد سے بدل ڈالنے کی کسی ممکن اور موزوں کوشش سے کبھی نہ تھکتے۔ اس لئے آپ صلعم کے اس طریق کار کا اقتضا یہی ہوگا کہ ملتِ اسلامیہ جب بھی اختلاف و انتشار سے دوچار ہو، اُس کی یہ اہم ترین ذمہ داری ہوگی کہ اپنی اس حالت کو اتحاد و تنظیم کی حالت سے لازماً بدل ڈالے۔

"سنت رسول" کے بعد "سنت خلفائے راشدین" کی طرف آیئے۔ چونکہ دورِ خلافت کا معاملہ دورِ نبوت کے معاملے سے فطری طور پر مختلف تھا اور اسمیں ملی اختلاف و انتشار کا پیدا ہوجانا عملاً ممکن تھا چنانچہ ایک حد تک وہ پیدا ہوا بھی، اسلئے خلفائے راشدین کی "سنت" سے ہمیں اس مسئلے میں راست رہنمائی مل سکتی ہے۔

سلسلۂ خلافت کی سب سے پہلی کڑی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ ہیں اور نہ صرف یہ کہ وہ اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی ہیں بلکہ آپ صلعم ہی کی سنت ہمیں سب سے واضح رہنمائی بھی مہیا کر رہی ہے، اسی لئے اس کا جائزہ لینا اس سلسلے میں سب سے زیادہ مناسب اور مفید رہے گا۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جب آپ رضؓ اُمت کے سربراہ مقرر ہوئے تو عرب کے بعض قبائل جو حلقۂ اسلام میں داخل چلے آرہے تھے اد لئے زکوٰۃ کے معاملے میں حکم عدولی پر اُتر آئے اور انھوں نے حکومت کو مالِ زکوٰۃ حوالے کرنے سے صاف انکار کردیا۔ صورت حال اتنی نازک اور پیچیدہ ہوگئی تھی کہ فاروقِ اعظم رضؓ جیسا اشدھم فی امر اللہ بھی کوئی سخت قدم اٹھانے کو صحیح نہیں سمجھ رہا تھا مگر حضرت صدیق اکبر رضؓ نے قبائل کے اس رویئے کو برداشت کرلینے کیلئے دین میں کوئی گنجائش نہیں پائی اور پوری عزیمت و استقامت کے ساتھ صاف لفظوں میں اعلان فرمادیا کہ :۔ "خدا کی قسم! اگر ان لوگوں نے اونٹ باندھنے کی کوئی ایک رسی بھی، جسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے، میرے حوالے کرنے سے انکار کیا تو میں ان سے اس کے لئے جنگ کروں گا۔" (مسلم، جلد اوّل)

اس اعلان کے لفظ لفظ کو اچھی طرح غور سے دیکھیے۔ حضرت صدیق اکبرؓ یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ اگر ان لوگوں نے زکوٰۃ نکالنا بند کر دیا تو میں ان سے جنگ کروں گا بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ان لوگوں نے زکوٰۃ کی رقم میرے (یعنی اسلامی حکومت کے) حوالہ کرنے سے انکار کیا تو میں اُن سے اس لئے جنگ کروں گا۔ دوسرے لفظوں میں آپ کے نزدیک بجائے خود یہ بات بھی جنگی اقدام کو ضروری قرار دے دیتی ہے کہ لوگ حکومت کے بیت المال میں اپنی زکوٰۃ داخل کرنے سے انکار کر دیں، چاہے اپنی جگہ زکوٰۃ کے نکالنے اور بطور خود اسے مستحقین پر تقسیم کر دینے میں وہ کسی کوتاہی کو روا نہ رکھتے ہوں۔ ہر شخص محسوس کرے گا کہ یہ واضح طور پر اسلامی نظامِ اجتماعی کا مسئلہ تھا۔ زکوٰۃ روک لینے والوں کا طرزِ عمل اس نظام میں ایک رخنہ ڈال رہا تھا، اور حضرت ابو بکرؓ کا یہ اعلانِ جنگ اس نظام کو اسی رخنے سے محفوظ رکھنے کے لئے تھا۔ اس لئے آپ کے اس طرزِ عمل سے آپ کی "سنت" یہ متعین ہوئی کہ ملی نظام اجتماعی میں پیدا ہونے والے کسی بھی خلل کو برداشت نہیں کیا جا سکتا اور ہر قیمت پر اس کی روک تھام یا اس کا ازالہ ضروری ہے۔

ایک دوسری روایت میں اسی واقعہ کی یہ مزید تفصیل موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے آپ کو جب یہ مشورہ دیا کہ "اے خلیفۂ رسول! ان لوگوں سے ملے جڑے نظر آیئے اور نرمی کا رویہ اختیار کیجئے۔" (یا خلیفۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم تالف الناس وارفق بھم) تو آپ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کے الفاظ یہ تھے:۔

"عمرؓ! زمانۂ جاہلیت میں جہاں تم اتنے سخت تھے وہاں اب اسلام میں اتنے بودے بن رہے ہو! کوئی شک نہیں کہ وحی کا سلسلہ موقوف، اور اللّٰہ کا دین مکمل ہو چکا ہے، کیا اب وہ میرے جیتے جی ناقص ہو رہے گا؟"

(مشکوٰۃ، باب مناقب ابو بکرؓ)

حضرت ابوبکر صدیق کے ان لفظوں سے زیر بحث مسئلے میں ایک اور پہلو سے رہنمائی ملتی ہے۔ آپ کے یہ الفاظ اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ دین کے مطالبات میں سے اگر کوئی ایک مطالبہ بھی پورا کرنے سے انکار کیا جا رہا ہو تو آپ کے نزدیک یہ دراصل دین کا جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے مکمّل کیا جا چکا ہے، ناقص ہو کر رہ جانا ہے اور مومن و مسلم ہونے کی شان یہ ہرگز نہیں ہے کہ صبر و سکون سے اس صورتِ حال کو برداشت کر لیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ اس دینی مطالبے پر عمل کرنے، عمل کرانے اور دینِ کامل کو ناقص ہو رہنے کے خطرے سے محفوظ کر لینے کو وقت کا اہم ترین فریضہ بنا لیا جائے۔ گویا دین کو ناقص بنائے جاتے وقت یا اس کے ناقص بنا دیئے جانے کی شکل میں خلیفہ رسول کی سنت، یہ ہوئی کہ اس کی اصل حالتِ کمال پر باقی رکھنے یا اس کی طرف واپس لے جانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اب سوچئے، شیرازہ ملّت کا بکھر جانا اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا جیسے بنیادی مطالبۂ دین کا فراموش ہو کر رہ جانا دین کے ناقص ہو رہنے کی بات ہوگی یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر چند قبائل کا حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرنا دین کے ناقص ہو رہنے کے ہم معنی ہے، تو پوری امت کا سرے سے بے امام و بے نظام بن جانا اور بیشمار احکامِ شریعت کا معطل ہو رہنا یقیناً دین کے ناقص ہی نہیں بلکہ ناقص تر اور اپاہج بن جانے کے ہم معنی ہوگا۔ اگر حقیقت یہ ہے تو اس کی موجودگی میں آنجنابؐ کی سنت کی پیروی صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ملّت کو پھر سے شیرازہ بند کیا جائے اور اس کی کھوئی ہوئی منظم زندگی اسے واپس دلا دی جائے۔

(۲) ایک دوسرا ارشادِ نبویؐ ملاحظہ ہو:۔

ان الدین بدء غریبا و یرجع غریبا فطوبیٰ للغرباء الذین یصلحون	"دین کا آغاز 'غربت' کے عالم میں ہوا تھا اور ایک وقت چل کر وہ پھر اسی عالم میں لوٹ جائے گا

کما افسد الناس من بعدی من سنتی۔ (ترمذی، جلد دوم ص۹۲) تو مبارک ہو ان غرباء کے لئے جو اسوقت میری سنت ہیں کی ان چیزوں کو پھر سے درست کریں گے جنہیں لوگوں نے بگاڑ رکھا ہو گا۔،،

اس حدیث میں امت کی آئندہ بگڑی ہوئی حالت کی خبر دیتے ہوئے جن لوگوں کو خوش بخت اور قابل مبارکباد فرمایا گیا ہے، غور کیجئے وہ کون اور کن صفات کے لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقے کے ان اجزاء کو پھر سے ٹھیک ٹھاک کریں گے جنھیں غافلوں اور بدعملوں کے ہاتھوں نے بگاڑ رکھا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں آئندہ کی ایک خبر دینے سے زیادہ دراصل ایک وصیت فرمائی ہے اور وہ یہ کہ جب بھی آپؐ کی سنت کے کسی جزو پر آنچ آئے، صاحب احساس مسلمان اس کی حفاظت یا بحالی کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ دنیا میں زندگی بسر کرنے اور اللہ کا بندہ بن کر رہنے کا جو طریقہ آپ چھوڑ گئے ہیں اس کے کسی ایک حصے کو بھی بے پروائی کے ساتھ حوادث زمانہ کی نذر ہو جانے دینا ایمان کی موت ہے، چاہے قانون (فقہ) کی نگاہ میں اس کی اہمیت چھوٹی سے چھوٹی کیوں نہ ہو کیونکہ جہاں تک اللہ کی بندگی اور رسول کی پیروی کا تعلق ہے آپ کی ہر سنت، سنت ہے اور آپ کا قائم کیا ہوا کوئی ایک نقش قدم بھی نہیں جسے مومن کی نگاہ مٹا یا مٹتا ہوا دیکھ سکے ــــــ یہاں پھر اسی سوال کو سامنے لائیے اور سوچئے کہ کیا ملت کے بند بند کا اکھڑ جانا اور اسطرح شریعت کے بیشمار احکام کا معاملاتِ زندگی سے بے تعلق ہو کر رہ جانا دین کا کوئی معمولی فساد اور سنت و طریق رسول کا کوئی چھوٹا موٹا بگاڑ ہے؟ یقیناً نہیں، یہ بگاڑ تو اتنا بڑا اور اتنا مہلک ہے کہ اس سے زیادہ بڑے اور مہلک بگاڑ کا دین و سنتِ رسول کے بارے میں تصور بھی مشکل ہے، پھر اس سب سے بڑے اور مہلک بگاڑ کے سلسلے میں وصیت نبویؐ کا حق کس طرح

ادا کیا جا سکتا ہے ، یعنی ان لوگوں کے کرنے کا کام کیا ہوگا جو صحیح معنوں میں اسلام کے پیرو ہوں اور جن کو "غربا،" کا خطاب مل سکتا ہو ؟ بلاشبہ اس سوال کا بھی ایک ہی جواب ہوگا اور وہ یہ کہ ملت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو پھر سے درست کرنے اور اس کے مطلوبہ نظم اجتماعی کو از سرِ نو قائم کر ڈالنے کی فکر ہر فکر پر غالب ہو جائے اور اسکی خاطر ہر وہ جدوجہد کی جائے جو کی جا سکتی ہو۔

قرآن اور سنت[2] کے بعد اگر ہم فقہی[3] اور کلامی اصولوں سے بھی دیکھنا چاہیں تو اس بارے میں جیسا کہ ہونا چاہیے، اس سے مختلف کوئی چیز نہ پائیں گے۔ چنانچہ گزشتہ ابواب میں "نظمِ مملکت کی دینی ضرورت" کے زیرِ عنوان ائمہ اسلام کی یہ تصریحات آپ کے سامنے آ ہی چکی ہیں کہ قیامِ خلافت کے واجب ہونے پر اُمت کا اجماع ہے اور اس قیامِ خلافت کی ضرورت علامہ تفتازانی کے لفظوں میں اس لئے ہے کہ "بہت سے واجباتِ شرعیہ کی بجا آوری اسی چیز پر موقوف ہے" (لان کثیرا من الواجبات الشرعیۃ یتوقف علیہ) یہ دونوں حقیقتیں اگر ناقابلِ انکار ہیں تو یہ بات بھی ناقابلِ انکار ہی ہوگی کہ یہ دونوں ایک تیسری حقیقت کا وجود ضروری ٹھہراتی ہیں اور وہ یہ کہ اگر امت میں اجتماعیت اور تنظیم باقی نہ رہ گئی ہو تو اس کا فرض ہوگا کہ اسے پھر سے اپنے اندر قائم کرے، کیونکہ یہی اجتماعیت اور تنظیم وہ چیز ہے جس پر خلافت و امامت کا قیام موقوف ہے۔ اگر دیواروں کے بغیر چھت نہیں بنائی جا سکتی تو نظمِ اجتماعی کے بغیر نظمِ خلافت بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔ مانا ہوا اصول ہے کہ وہ کام بھی فرض بن جاتا ہے جس پر کسی کا فرض کا ادا ہونا موقوف ہو۔ بہت سے دینی احکام کی بجا آوری ایک امام کے تقرر پر موقوف ہے اور امام کا تقرر امت[3] کے شیرازہ بند ہونے پر منحصر ہے۔ اس لئے پہلی بات کا ضروری ہونا دوسری کے ضروری ہونے کی دلیل بن گیا اور جب دوسری ضروری ہو گئی تو اس سے تیسری کا بھی ہونا آپ سے آپ لازم آ گیا۔

نظمِ اجتماعی کی بحالی کا طریقہ

یہاں پہنچ کر ہمارے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اس کام کا صحیح طریقہ کیا ہوگا؟ یہ امت، جو ایک بھیڑ کی شکل اختیار کرچکی ہے پھر "الجماعۃ" کس طرح بن سکتی ہے؟ اور اسے اُس کی کھوئی ہوئی منظم اجتماعیت واپس کیسے مل سکتی ہے؟ یہ سوال بجائے خود تو کافی اہم تھا ہی، مگر موجودہ صورتِ حال نے اسے اور زیادہ اہم اور ساتھ ہی سخت پیچیدہ بنا دیا ہے کیونکہ یہ سوال اگرچہ ایسا فطری اور عملی سوال تھا جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے ذہن میں برابر موجود چلا آرہا ہے اور اس لئے اس کا جواب بھی برابر سوچا جاتا رہا ہے، لیکن اس سوچ بچار کے سلسلے میں اب تک عام طور پر جو کچھ سنا اور دیکھا گیا ہے وہ سخت ناتسلی بخش ہی نہیں بلکہ، بجائے خود اختلاف و انتشار کی ایک افسوس ناک مثال ہے جس کے نتیجے میں یہ مسئلہ بہت کچھ الجھ بھی گیا ہے۔ اس لئے اس پر ہمیں پوری توجہ سے غور کرنا ہوگا ـــــ اس غور و فکر کی ابتدا کرتے وقت تین بنیادی اور مسلم حقیقتیں ہمارے ذہنوں میں بالکل واضح رہنی چاہیئے:۔

ایک۱ تو یہ کہ امتِ مسلمہ کو ضرورت، جیسا کہ "اسلامی اجتماعیت" کی بحث میں تفصیل سے بتایا جاچکا، کسی مجرد اور بے قید اجتماعیت کی نہیں ہے بلکہ اس کو ایک مخصوص قسم کی اجتماعیت اور وحدت مطلوب ہے جس کا شیرازہ صرف اللہ کی رسی ہو اور جس کے وجود کا مقصد، شہادتِ حق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اقامتِ دین کے سوا کچھ نہ ہو۔

دوسری۲ یہ کہ جس طرح منظم اجتماعیت کی بحالی ایک دینی ضرورت ہے، اسی طرح اس بحالی کا طریقہ بھی "دینی" ہی ہونا چاہیئے یعنی اس طریقے کا تعین صرف کتاب الٰہی اور سنت رسولؐ کریں گی، نہ کہ زید و بکر کے فلسفے اور نظریے یا غیر اسلامی تحریکوں کے تجربے اور "سنتیں"۔

تیسری۳ یہ کہ ہم جس طرح اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، سے کوئی راست اور صریح ہدایت نہیں پاسکتے کہ ملی انتشار کی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اسی طرح

اس بارے میں بھی نہیں پا سکتے کہ جو کچھ کرنا ہے اُسے کس طرح کرنا چاہیے؟ اور یہاں بھی وجہ ٹھیک وہی ہے جو وہاں تھی، یعنی یہ کہ اس وقت امت کی جس حالتِ اختلاف کو سامنے رکھ کر ہم گفتگو کر رہے ہیں وہ اس حالت سے بہت مختلف ہے جس میں آنحضرت کو کام کرنا پڑا تھا۔ ہمارے سامنے ایک ایسی مسلمان ملت کی اصلاح و تنظیم نو کا مسئلہ ہے جو پہلے سے موجود چلی آرہی ہے جبکہ رسول اللہ صلعم کے سامنے مسئلہ ایک نئی امت کی تشکیل کا تھا۔ اس لئے نظمِ اجتماعی کی بحالی کا کام کرنے کیلئے اگر رسول خدا صلعم کے اُسوے اور طریق کار میں کوئی ہدایت مل سکتی ہے تو وہ آپؐ کے اُسوے سے اخذ کی ہوئی ہدایت ہی ہو سکتی ہے، پھر یہ بات یہیں تک نہیں رہتی بلکہ اس کے تقاضے اور آگے تک پہنچتے ہیں۔ دونوں حالتوں کے اس فرق کی وجہ سے، جس کا ذکر ابھی ہوا اگر زیرِ بحث حالت کیلئے صریح اور راست رہنمائی اسوہ نبی سے نہیں مل سکتی تو خود قرآن مجید سے بھی نہیں مل سکتی، اس کی وجہ قرآن حکیم کی وہ مخصوص نوعیت ہے جو اسے خالص علمی کتابوں سے ممیز کرتی ہے۔ علمی کتابوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع سے تعلق رکھنے والی تمام ممکن باتوں اور حالتوں کو ایک ایک کر کے لیتی ہیں اور انکے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتی چلی جاتی ہیں، انکو اس بات سے بہت کم بحث ہوتی ہے کہ اس وقت انکے مخاطب کے عملی مسائلِ حیات کیا ہیں بلکہ بسا اوقات تو ان کا کوئی متعین مخاطب بھی نہیں ہوتا! اور وہ بالکل تصورات کی دنیا میں اپنے فلسفے بگھار رہی ہوتی ہیں لیکن اللہ کی کتاب انسانیت کا ہاتھ پکڑ کر اُسے فلاح کی منزل تک پہنچانے کیلئے آئی تھی۔ اُس کا ایک متعین مخاطب تھا اور ایک متعین مشن، وہ جو کچھ کہتی ضرورتِ وقت کے تقاضے ہی پر کہتی۔ اس لئے اس نے امتِ مسلمہ کو نظمِ اجتماعیت کے ہتھیاروں سے مسلح کرنے کے سلسلے میں ہدایتیں دیتے وقت اگر ایک نئی اُمت کی تشکیل ہی کے مسئلے کو سامنے رکھا اور پہلے سے موجود کسی پراگندہ مسلمان ملت کو ذہن میں رکھ کر صراحتہً کوئی بات نہیں فرمائی تو اُسے ایسا کرنا ہی چاہیے تھا۔

ان تینوں واضح اور مسلم حقیقتوں کو ذہن میں رکھیے۔ اس کے بعد اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر نظر ڈالئے اور یہ دیکھئے کہ ان کی رو سے ملت کی نئی تنظیم کا صحیح طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ ——— قرآن مجید نے امت مسلمہ کی تشکیل کے وقت اسے متحد و منظم کرتے جانے کے بارے میں جو بنیادی ہدایتیں دی تھیں ان کا تعارف پچھلے اوراق میں "اسلامی اجتماعیت" کے زیر عنوان، پوری تفصیل سے گذر چکا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہدایتوں کی تعمیل کس طرح کی تھی۔ یہاں ان ساری چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس اہم سوال پر غور کیجئے کہ ملت کی تنظیم جدید کے مسئلے میں ان قرآنی ہدایتوں کی اطلاق اس معاملے پر بھی ہو گا یا نہیں؟ اور اگر ہو گا تو کس حد تک؟

اس سوال کو حل کرنے کے لئے ہمیں قرآن مجید کی ان ہدایتوں کے الفاظ اور انداز بیان کا اور رسول خدا صلعم کے اس طریق عمل کی داخلی نوعیت کا پھر سے جائزہ لینا ضروری ہو گا، اور گہری نظر ڈال کر دیکھنا ہو گا کہ ایک خاص صورت حال سے متعلق ہونے کے باوجود ان کے اندر عموم کی شان پائی جاتی ہے یا نہیں، یعنی انکی حیثیت بنیادی طور پر عام اور اصولی ہدایات کی ہے یا حقیقت واقعی اس کے برعکس ہے؟ یہ جائزہ ہمیں اس کا جواب واضح طور پر اثبات میں دیگا کیونکہ متعلقہ آیتوں میں ہم اس طرح کا کوئی اشارہ بھی نہیں پاتے جس سے یہ محسوس کیا جا سکے کہ قرآن کی یہ ہدایتیں بنیادی طور پر صرف نبی کے ذریعہ بننے والی ایک نئی امت کی تشکیل و تنظیم ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور اگر اس کے بجائے پہلے سے موجود مسلمان ملت کی اصلاح، تعمیر اور تنظیم کا مسئلہ سامنے ہو تو اس کے لئے کوئی اور طریقہ اپنانا چاہئے۔ اس کے بخلاف ہم صاف دیکھتے ہیں کہ ان آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں کی کوئی بات بھی ایسی نہیں جو مسلم اصولی ہدایت کی شان نہ رکھتی ہو، حتیٰ کہ اُن میں خطاب کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ بھی بالکل عمومی ہے یعنی بات یوں نہیں فرمائی گئی ہے کہ اے نبی! امت مسلمہ کی تشکیل و تنظیم ان بنیادوں پر کرو

یا اے اصحابِ نبیؐ! تمہیں ان خطوط پر اپنے کو سنوارنا اور منظم کرنا چاہیئے بلکہ یوں فرمائی گئی ہے کہ "اے اہلِ ایمان! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو..... اور تم سب اللہ کی ـــــ رسی کو مضبوط پکڑ لو۔" کیا یہ اس حقیقت کا واضح قرینہ نہیں کہ "اہلِ ایمان" کو اپنی تنظیم کا فریضہ ہمیشہ انہی خطوط پر انجام دینا چاہیے، چاہے وہ اُس وقت کے اہلِ ایمان" ہوں جب کہ امّت کی تشکیل ہو رہی تھی، چاہے بعد کے کسی دور کے "اہلِ ایمان" ہوں جب کہ ملت کے منتشر ہو جانے کے باعث اس کی تنظیم جدید کی ضرورت درپیش ہو گی۔

عقلی پہلو سے دیکھا جائے تو اس کے نتیجے میں بھی کوئی دوسری بات نہ پائی جائے گی، کیونکہ معاملہ چاہے تشکیل اُمّت کے وقت کی تنظیم کا ہو چاہے بعد کی تنظیم کا، یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ جب مقصد ایک ہے تو صرف اتنی سی بات سے کہ 'ایک کے ارکان' باہر، سے چھانٹ چھانٹ کر اکٹھے کئے جاتے ہیں اور دوسری کے اندر ہی سے بلائے جاتے ہیں۔ کام کے طریقوں میں کون سا بنیادی فرق پڑ سکتا ہے؟ ہاں جہاں تک افراد کے اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی حقوق کا تعلق ہے، اس اندر اور باہر کی بنا پر فرق ضرور واقع ہو جائے گا اور ایک غیر مسلم کے مقابلے میں ایک بے عمل مسلمان کے حقوق بھی بہرحال کہیں زیادہ ہوں گے، خواہ اس دعوتِ تنظیم کے جواب میں اس کا رویہ معاندانہ ہی کیوں نہ ہو، بس یہی ایک فرق ہے، جو دونوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ فرق اپنی جگہ بڑا عظیم فرق ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ تنظیم ملت کے بنیادی اصولوں پر وہ کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا، اثر انداز ہونا تو الگ رہا، اس فرق کا اس مسئلے سے کوئی، تعلق ہی دکھائی نہیں پڑتا۔

غرض جس پہلو سے بھی دیکھئے، ملت کی تنظیم جدید کا طریقہ بھی بنیادی طور پر وہی ہو گا جو امتِ مسلمہ کی تشکیل کے متعلق قرآنِ حکیم اور اسوۂ رسولؐ میں پایا جاتا ہے اور وہ ان نکات پر مشتمل ہو گا؛

(۱) کام کی ابتداء "رجوع الی الحق" کی دعوتِ عام سے کی جائے۔ پوری قوت سے ملت کی خود شناسی کو ابھارا جائے، اُسے یاد دلایا جائے کہ وہ اس زمین کی سطح پر کس کام کے لئے موجود ہے اور جس دین سے اپنی وابستگی کا دعویٰ رکھتی ہے وہ اس کے افراد کو کن صفات سے آراستہ اور اُسے اجتماعی طور پر کس مقدس مہم میں مشغول دیکھنا چاہتا ہے۔ اس 'نفیرِ عام' کے جواب میں اس کے جو افراد شعور کے ساتھ لبیک کہہ کر آگے بڑھیں، انھیں بتایا جائے کہ تمہارے آقا و مولیٰ کا مطالبہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو اور اس کی رضا کے سوا تمہارے سامنے اور کوئی چیز ایسی نہ رہ جائے جس پر تمہاری نگاہیں ٹک سکیں (اتقوا اللہ حق تقاتہٖ و لا تموتن الا و انتم مسلمون ۰)

(۲) جو لوگ 'رجوع الی الحق' کی اس دعوت کو فکری طور پر اطمینانِ قلب کے ساتھ قبول کر لیں اور عملی طور پر اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے پر تیار ہو جائیں، انھیں بتایا جائے کہ اپنے جس بھولے ہوئے مقصد کو تم پھر سے اپنا رہے ہو، وہ ایک عظیم مقصد اور دشوار مہم ہے، تم اسے سر کرنے کے قابل اس وقت تک ہرگز نہیں بن سکتے جب تک کہ تم سب ایک تنظیم، ایک وحدت اور ایک بنیان مرصوص، نہ بن جاؤ۔ اس کے علاوہ مومن و مسلم ہونے کا فطری تقاضا بھی یہی ہے۔ اس لئے تمہارا الگ الگ متقی اور مسلم بن جانا ہی کافی نہ ہوگا، بلکہ ضروری ہے کہ تم سب مل کر ایک ایسی منظم جماعت بن جاؤ جو اپنے اجتماعی وجود میں بجائے خود بھی ایک "مومن" متقی اور مسلم وجود ہو۔ اس طرح جو لوگ ایک منظم جماعت کی شکل اختیار کر لینے کے لئے تیار ہوں ـــ اور اگر وہ اپنے 'رجوع الی الحق' کے فیصلے میں مخلص ہوں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے لئے تیار نہ ہوں ـــ انھیں اس تنظیم کا جزوِ ترکیبی بنانے والی چیز 'حبل اللہ' (یعنی اللہ کے دین) اور 'دخول فی السلم' (یعنی کامل اطاعت) کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہیئے۔ کسی ایسے شخص کو اس تنظیم میں ہرگز نہ لیا جائے جسے کوئی اور رشتہ لا کر جوڑ رہا ہو جس کا حقیقی محرک اللہ کی رضا

اور آخرت کی کامیابی کے سوا اور کچھ ہو اور جس کے سامنے صرف امر بالمعروف، شہادتِ حق اور اقامتِ دین کا ہی فریضہ انجام دینا نہ ہو۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً و لا تفرقوا)

(۳) قائم ہونے والی تنظیم کے دو حقیقی فرائض ہوں گے جن سے وہ ایک لمحے کے لئے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتے اور جن پر اس کی کوشش برابر مرکوز رہیں گی۔ ایک تو یہ کہ دوسرے افراد ملت کو "رجوع الی الحق" کی دعوت دے۔ دوسرے یہ کہ افرادِ تنظیم کی تعلیم و تربیت کا اہتمام رکھے۔ ان دونوں باتوں کی ضرورت اور اہمیت بالکل واضح ہے۔ پہلی کا منشاء یہ ہے کہ تنظیم کا اکھوا برابر بڑھتا رہے یہاں تک کہ وہ تناور درخت بن جائے اور امت کے بکھرے ہوئے اجزا ایک ایک کر کے اس کے نیچے آ جائیں۔ دوسری کی غرض و غایت یہ ہے کہ تنظیم کی اندرونی توانائی برابر قائم رہے، نہ صرف قائم رہے بلکہ بڑھتی رہے۔ اس کے افراد میں ایمان، تقویٰ اور اسلام کی روح مرجھانے نہ پائے بلکہ پیہم حیات تازہ پاتی رہے۔ ان کے اندر تنظیم سے وابستگی کا حقیقی محرک کبھی نہ کمزور پڑنے پائے، نہ کسی اور محرک سے متاثر ہونے پائے۔

تنظیمِ نو کی عملی شکل

تنظیم ملت کا طریقہ متعین ہو جانے کے بعد یہ بحث اصولاً تو ختم ہو جاتی ہے مگر عملاً ختم نہیں ہوتی، کیونکہ ایک مسئلہ اب بھی حل طلب رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس تنظیم نو کی عملی شکل کیا ہوگی؟ یہ کام کس طرح انجام پائے گا؟ ایک نبی کی موجودگی میں تو یہ مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں رہتا لیکن جب صرف امت ہی امت ہو تو یہ ایک اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ البتہ جہاں تک طریق تنظیم کے پہلے اصولی نکتے کا تعلق ہے، اس کی حد تک تو عمل درآمد کا معاملہ بالکل صاف ہے۔ کیونکہ یہ بات ہر وقت متوقع ہے کہ فضا میں فرض کا احساس ابھر آئے اور کوئی شخص یا کچھ اشخاص "رجوع الی الحق" کی منادی کرتے اٹھ کھڑے ہوں اور توقع کی بھی کیا بات ہے؟ ایسا تو کسی نہ کسی شکل میں آئے دن ہوتا ہی رہتا ہے لیکن پھر بعد میں کیا ہو؟ کارِ تنظیم کے باقی دونوں اصولی نکتوں پر

عمل کیسے ہو، آگے قدم کس طرح بڑھے؟ اس ابھرے ہوئے احساسِ فرض کو اور رجوع الی الحق کی اس ابتدائی منادی کو، مطلوبہ تنظیم کی آخری منزل تک پہنچا دینے کا پروگرام کیا ہوگا؟ یہ مسئلہ صاف اور واضح بالکل نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنا حل چاہتا ہے، غور کرنا چاہئیے کہ اس کا صحیح حل کیا ہوگا؟

ظاہر ہے کہ اس حل کو تلاش کرنے کے لئے بھی ہمیں کسی اور چیز سے نہیں، بلکہ کتاب و سنت ہی سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیئے۔ یہ رہنمائی ہمیں جن آیتوں اور حدیثوں سے مل سکے گی اُن میں سے کئی ایک کتاب کے ابتدائی مباحث میں نقل بھی کی جاچکی ہیں۔ ایک بار ان پر نظر ڈال لیجئے۔ اس کے بعد سوچئے، جو دین ہر کام کو حتی الوسع باہم مل کر اور ایک امام یا امیر کی قیادت میں انجام دینا ضروری یا کم از کم یہ کہ پسندیدہ قرار دیتا ہو، جو نماز جیسی بظاہر مکمل علیحدگی اور تنہائی چاہنے والی عبادت کے لئے جماعت کا مثالی اہتمام اور ایک امام کی معیاری اقتدا، واجب قرار دیتا ہو جو زکوٰۃ، حج اور روزے کی عبادتوں کو بھی ممکن حد تک اجتماعی شکل ہی میں ادا کرنے کا حکم دیتا ہو، جو اس بات تک کو جائز نہ سمجھتا ہو کہ جنگل میں سفر کرنے والے تین آدمی بھی اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر نہ بنائے ہوئے ہوں۔ کیا ایسا دین اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ تنظیم ملت جیسی عظیم الشان مہم کسی نظم و قیادت کے بغیر انجام دی جائے؟ اور کیا تنظیم کا یہ طریقہ اس کی ان ہدایتوں سے ہم آہنگ اور اس کے مزاج کے مطابق ہوگا؟ عقل سلیم اس سوال کا جواب یقیناً نفی ہی میں دے گا۔ بلاشبہ مکی دور میں ہم جماعت اور امیر، نظم، اور اطاعت، کے الفاظ بولے جاتے نہیں سنتے۔ مگر یہ نگاہ کا دھوکا ہوگا اگر ہم اس سے یہ خیال کر لیں کہ وہاں ان الفاظ کے معنی بھی موجود نہ تھے۔ جس ذاتِ گرامی پر اس کے فدا کار ساتھی اپنی جانیں چھڑکتے تھے، جو اس آسمان کے نیچے ان کی سب سے محبوب متاع تھی جس کے اشارے بھی ان کے لئے بڑے سے بڑے آمروں اور شہنشاہوں کے فرامین سے بڑھ کر واجب التعمیل اور قابلِ احترام تھے، وہ کب اس بات کی ضرورت مند تھی کہ

ان کے سامنے اپنی قیادت اور امارت کا قانونی لفظوں میں اعلان کرے! اور ان سے اپنی اطاعت کے عہد نامے لکھوائے، چنانچہ اس پورے دور میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پایا جا سکتا جو اس بات کا ثبوت ہو کہ وہاں معنیً بھی نظم اجتماعی اور نظم اطاعت موجود نہ تھا۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اہلِ ایمان کی شان میں "وامرھم شوریٰ بینھم" کے الفاظ مکہ ہی میں نازل ہوئے تھے۔ کیا یہ الفاظ ان لوگوں کے حق میں فرمائے جا سکتے تھے جن میں نہ کوئی اجتماعیت ہو، نہ کوئی نظم؟ کوئی شک نہیں کہ تاریخی حقائق کی طرح یہ الفاظِ قرآنی بھی اس امر کا ثبوت ہیں کہ مکی دور میں نظم و اطاعت کے الفاظ چاہے استعمال نہ کیے گئے ہوں لیکن وہاں ایک مضبوط نظم ضرور موجود تھا۔ ایک جاندار اجتماعیت یقیناً کار فرما تھی، دعوت اور امت کے اہم معاملات میں سر جوڑ کر بہر حال بیٹھا جاتا تھا، غور و بحث کے بعد فیصلے ہوتے تھے، اور ان فیصلوں کے مطابق ہی پورا گروہ مومنین عمل پیرا ہوتا تھا اور نبیؐ کے اذن کے بغیر کوئی بات انجام نہ پاتی تھی۔

بہتر ہوگا کہ اس جگہ ایک اصولی حقیقت سمجھ لی جائے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب تک دعوتِ حق کو قبول کرنے والے افراد اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں جس طرح کے لوگ مکی دور کے اہلِ ایمان تھے اور ان کا داعی و رہنما اس طرح کی شخصیت ہوتی ہے جس طرح کی شخصیت ان کے درمیان وہاں موجود تھی، اس وقت تک 'جماعت'، اور 'امارت'، 'نظم' اور 'اطاعت' کے الفاظ بولے جانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس وقت ان الفاظ کا بولا جانا اس شخصیت کے مقامِ عظمت و محبوبیت پر بھی حرف لانا ہے اور اس کے مخلص پیرووں کے جذبۂ محبت و تعظیم کی بھی اک گونہ توہین ہے۔ یہ الفاظ تو صرف اسی وقت بولے جا سکتے ہیں جب یہ دونوں باتیں، یا ان میں سے کوئی ایک موجود نہ پائی جاتی ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مکے میں جہاں 'اعتصموا باللہ' کی تلقین کافی تھی وہاں مدینے میں 'بحبل اللہ' کی صراحت ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ 'ولا تفرقوا' کی کھلی ہدایت

بھی ضروری ہوگئی[1] اسی طرح مکی دور میں نظم و اطاعت کا ظاہر لفظوں میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا مگر مدنی دور شروع ہوتے ہی "اطیعوا الرسول" کے الفاظ استعمال کئے جانے لگے ایسا صرف اس لئے ہوا کہ مدینے میں پہلی بات موجود نہ رہ گئی تھی، یعنی اس وقت کے "اہلِ ایمان" بلا استثنا سب کے سب ویسے ہی مخلص، فداکار اور سراپا اطاعت نہیں رہ گئے تھے جیسے کہ مکی دور کے تھے۔ بلکہ ان میں ایک خاصی تعداد کچے مسلمانوں کی اور منافقوں کی بھی آگھسی تھی، جن کا ایمانی ضعف یا نفاق انھیں دینی مطالبوں کی خلاف ورزیاں کرجانے پر اکسا دیا کرتا تھا اس لئے اب ناگزیر ہوگیا کہ وہ مومنین کو ایک متحد گروہ بنے رہنے کا، اور اللہ و رسول اور اولوالامر کی اطاعت کا، صریح لفظوں میں بھی حکم دیا جائے۔

یہ تو اس صورتِ حال کی مثال تھی جب کہ داعی اور رہنما کی شخصیت معیاری اور مثالی قسم کی ہو، مگر اس کے پیرو تمام کے تمام معیاری اور مثالی قسم کے نہ ہوں، رہی اس کی الٹی صورتِ حال کی بات، تو اس کی مثالوں سے تاریخِ اسلام بھری پڑی ہے۔ جہاں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ جب بھی کچھ مسلمان کسی ضرورت کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور قیادت سے کچھ دنوں کے لئے الگ ہوتے تو ایک امیر کے بغیر اپنے قدم نہ اٹھاتے۔ مدنی دور میں آئے دن وفود بھیجے جاتے اور مہمیں روانہ کی جاتی تھیں مگر کوئی وفد یا کوئی دستہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس کا ایک امیر نہ ہو۔ مکی دور میں اگرچہ اس طرح کی صورتیں پیش آنے کے حالات و مواقع نہ ہونے کے برابر تھے لیکن اگر کبھی ایسی صورت پیش آئی تو اس وقت بھی کوئی دوسرا طریق کار اختیار نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہجرتِ حبشہ کے موقع پر جب کچھ مسلمان آپ کی صحبت سے الگ ہو رہے تھے تو ایسا نہیں ہوا کہ ہر شخص نے اپنے طور پر اپنی راہ لی ہو بلکہ سب نے ایک جماعت بن کر اور

---

[1] اِعْتَصِمُوا بِاللہِ کے الفاظ سورہ حج کے ہیں جو مکی سورہ ہے اور اِعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کا ارشادِ الٰہی سورہ آل عمران کا ٹکڑا ہے جو مدنی سورہ ہے۔

ایک قیادت کے تحت ہجرت کی تھی۔ سب سے پہلا قافلۂ مہاجرین دس آدمیوں پر مشتمل تھا اور حضرت حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو آپؐ نے اس قافلے کا سربراہ مقرر فرمایا تھا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۱) ـــــ غرض مکی دور کی ظاہری صورت حال کو دیکھ کر یہ گمان کر بیٹھنا صحیح نہ ہوگا کہ وہاں فی الواقع بھی کوئی اجتماعی نظم کارفرما نہ تھا۔

اس بحث سے ملت کے طریق تنظیم کے بارے میں دین کا تقاضا اور شریعت کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ اور کتاب وسنت کی عام اجتماعیاتی ہدایتیں یہی تلقین کرتی ہیں کہ ملّت کی اصلاح وتنظیم جدید کا فریضہ بھی اجتماعی طور پر، ایک نظم اور ایک قیادت کے تحت انجام پانا چاہئے ـــــ شرعی نقطۂ نگاہ کے بعد اگر عقلی اور تجرباتی پہلوؤں سے دیکھیے تو بھی بات یہی نکلے گی۔ تاریخ کے وسیع ذخیرے میں اس بات کی کوئی ایک مثال بھی نہیں پائی جاسکتی کہ دنیا کا کوئی اجتماعی انقلاب کسی اجتماعی اور منظم سعی وجدوجہد کے بغیر برپا ہوا ہو۔ اس دنیا میں کام کرنیوالے قوانین کہتے ہیں کہ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہوسکتا ہے اس لئے ایک مضبوط اجتماعی نظم کے بغیر اگر تنظیم ملّت کی مہم چلائی جائے گی تو وہ بھی کامیاب نہ ہوسکے گی۔ اس سلسلہ میں انفرادی اصلاح وتربیت کی جو کوششیں انجام دی جائیں گی اُن کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ "مسلمانوں" کے اس جنگل میں کچھ مخلص دیندار اور ملی نظام اجتماعی کی بحالی کے خواہش مند افراد پیدا ہو جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسے افراد کی تعداد "کچھ کے بجائے" بہت" ہو مگر جب تک اس متفقہ اجتماعی نصب العین کو پالینے کا جذبہ ان سب کو ایک ہی شیرازے میں مضبوطی سے باندھے ہوئے بھی نہ ہو اور اس غرض کیلئے اجتماعی نظام اور قیادت موجود نہ ہو، ملت اس اجتماعیت سے قیامت تک بہرہ ور نہیں ہوسکتی جو اللہ کے دین کو مطلوب ہے اور جس کے بغیر بقول سیدنا عمرؓ اسلام، اسلام نہیں رہتا۔ ایسے مخلص دیندار اور ملی تنظیم کے خواہش مند افراد کے وجود کو، جو بجائے خود اپنی کوئی تنظیم اور قیادت نہ رکھتے ہوں، ملت کی

تنظیم نو کی ضمانت سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے پکی اینٹوں کو تلے اوپر رکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ کسی جنگی قلعے کی دیوار تیار ہو گئی ہے۔ یقیناً یہ بڑی ہی عجیب بات ہو گی کہ مسلمانوں کے اور سارے کام تو منضبط طور پر، ایک نظم اور قیادت کے تحت انجام پائیں، اُنکا دین اُن سے یہی چاہتا ہو، مگر ٹھیک وہی مہم اس طرح کے نظم و انضباط سے بے بہرہ ہو جو ملّت کو ایک مضبوط اجتماعیت اور نظم سے بہرہ ور کرنے ہی کے لئے جاری کی گئی ہو۔ کیا ایسی صورت میں یہ مہم اپنی مخالف خود آپ ہی نہ ہو گی؟ اور کیا اس کے ناکام ہو جانے کا یقین دلانے کے لئے خود یہی بات کافی نہ ہو گی کہ نظم و اجتماعیت کی اس متلاشی جدوجہد میں سب کچھ ہے مگر ایک نظم و اجتماعیت ہی نہیں ہے؟

غرض جس پہلو سے بھی دیکھئے، ملی تنظیم کے باقی دونوں اصولی نکات کو بروئے کار لانے کی شکل عملاً یہی قرار پائے گی کہ جو لوگ اس مقصد سے شعوری طور پر وابستہ ہو جائیں وہ ایک جماعتی نظم قائم کریں، اور اپنے میں سے ایک ایسے فرد کو اس نظم کا سربراہ منتخب کریں جو اس مقصد کی سب سے زیادہ اچھی خدمت انجام دے سکتا ہو۔ پھر ان کا ایک موثر شورائی نظام ہو جو " امرھم شوریٰ بینھم" کے تقاضوں کا حق ادا کرتا ہو، اور اس طرح پورے نظم و ضبط کے ساتھ یہ بھاری اور لمبی مہم مسلسل چلتی رہے۔

یہ حقیقت کسی اظہار و بیان کی محتاج نہیں کہ یہ جماعت بجائے خود 'الجماعہ' نہ ہو گی، نہ یہ تنظیم، ملی تنظیم کا بدل ہو گی، بلکہ اُسے وجود میں لانے کے لئے ہو گی۔ "سنت رسولؐ" اور سنت خلفائے راشدین، کے ہاتھوں میں اس کی زمام کار رہے گی۔ اپنی غربت اور اجنبیت سے وہ پہچانی جائے گی۔ دین حق اور طریق رسولؐ کے جس گوشے کو بھی اجاڑا یا بگاڑا جا چکا ہے، اس کی تعمیر و اصلاح میں وہ کسی سعی ممکن سے دریغ نہ کرے گی۔

(اَلَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَآ اَفْسَدَ النَّاسُ)

گوشہ گیری

گوشہ گیری کی مشروعیت

ایک طرف تو ایمان و اسلام کے لئے منظم اجتماعی زندگی کا وجود اس حد تک ناگزیر ہے جس کی وضاحت پچھلے صفحات پیش کر رہے ہیں، دوسری طرف قرآن حکیم کے بعض اشارات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کھلے ہوئے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعیت سے یکسر ناآشنا اور گوشۂ تنہائی کی زندگی بھی غیر اسلامی زندگی نہیں، بلکہ ٹھیک اسلامی زندگی ہے، اور اسے اللہ کے رسولؐ کی رضا حاصل ہے۔ مثلاً:۔

سورۂ کہف کے دوسرے رکوع کو پڑھیئے، جہاں 'اصحاب کہف' کا تذکرہ ہے۔ یہ اصحابِ کہف وہ لوگ ہیں جو انسانی بستیوں سے دور ہٹ کر ایک محفوظ غار میں جا بیٹھے تھے، اور وہیں اپنے اللہ کی یاد میں مشغول ہو رہے تھے۔ یوں کہیئے کہ غیر اجتماعی زندگی کی آخری شکل انھوں نے اختیار کرلی تھی۔ قرآن مجید نے ان کی اس سرگزشت کو جس انداز میں بیان کیا ہے اُس سے اُن کی اس روش پر کسی ہلکی سے ہلکی ناپسندیدگی کا بھی اظہار نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اس نے اسے خدا پرستی کے ایک قابل قدر اور اونچے نمونے کی حیثیت سے پیش کیا ہے، ان غار نشینوں کو 'ایمان میں پختہ' اور 'ہدایت میں بلند مرتبہ' قرار دیا ہے:۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ — بلاشبہ یہ (کچھ) ایسے جوان تھے جو اپنے رب

وَزِدْنَاهُمْ هُدًى (کہف۔ ۱۳)

پر ایمان لائے تھے، اور جنھیں ہم نے ہدایت کی افزونی عطا فرمائی تھی۔

اسی طرح یہ حدیثیں دیکھئے۔

(۱) قَالَ رَجُلٌ اَیُّ النَّاسِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ مُؤْمِنٌ یُجَاھِدُ بِنَفْسِہٖ وَمَالِہٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ ثُمَّ مُؤْمِنٌ مُعْتَزِلٌ فِیْ شِعْبٍ مِنَ الشِّعَابِ یَعْبُدُ رَبَّہٗ وَیَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ (مسلم، باب فضل الجہاد والرباط)

ایک شخص نے پوچھا "اے اللہ کے رسولؐ! سب سے افضل انسان کونسا ہے؟ فرمایا "وہ مسلمان جو اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے"، اس نے کہا "پھر کون؟" ارشاد ہوا۔ "پھر وہ مسلمان جو کسی گھاٹی میں جاکر گوشہ نشین ہوگیا ہو، وہاں اپنے رب کی عبادت کرتا ہو اور لوگوں کو اپنے شر سے دور چھوڑے ہوئے ہو"

حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں "یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ" کے موقع پر "یَعْتَزِلُ شُرُوْرَ النَّاسِ" (لوگوں کے شر کو چھوڑے ہوئے اور اس سے دور رہتا ہو) کے الفاظ ہیں (فتح الباری ج ۶ص)

(۲) یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ خَیْرُ مَالِ الْمُسْلِمِ الْغَنَمُ یَتْبَعُ بِھَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ یَفِرُّ بِدِیْنِہٖ مِنَ الْفِتَنِ۔ (بخاری، باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب ایک مسلمان کی سب سے اچھی دولت اس کی بکریاں ہوں گی جنھیں لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی کی جگہوں میں گھومتا پھریگا، اپنے دین کو سینے سے لگائے فتنوں سے بھاگتا رہے گا۔

ان حدیثوں کے آئینے میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ اگر مومن جماعتی زندگی سے الگ ہوکر یادِ حق میں مصروف ہورہے تو یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی، بلکہ ایک بہترین رویہ ہوگا جو اس نے اپنایا ہوگا۔

عزیمت نہیں رخصت

بلاشبہ اس طرح کی باتیں اور ہدایتیں بھی قرآن اور حدیث میں موجود ہیں۔ اور جب ایک چیز قرآن و حدیث میں موجود ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی طرح 'اسلامی' ہے جس طرح کہ کوئی اور چیز ہو سکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں 'اسلامی' ہونے کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ کہ یہ تنہائی کی زندگی بھی مطلقاً اسلامی زندگی ہے، اور جب بھی اسے اختیار کیا جائے گا ٹھیک اسی طرح معیاری اور اللہ و رسولؐ کی پسندیدہ زندگی قرار پائے گی جس طرح کہ منظم اجتماعی زندگی قرار پا چکی ہے، یا کچھ اور؟ اس سوال کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لئے ہمیں ذیل کی تین اصولی باتوں پر غور کرنا ہوگا:۔

(۱) ایک منظم اجتماعی زندگی اختیار کرنے کی جو ہدایتیں مسلمانوں کو دی گئی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟

(۲) انسان کے پیدا کئے جانے کی غرض و غایت، اور امتِ مسلمہ کا مقصد وجود یہ دونوں چیزیں گوشہ نشینی کے رویّے کو کس نظر سے دیکھتی ہیں۔

(۳) خود قرآن اور حدیث کے وہ ارشادات، جن سے گوشہ نشینی کے رویّے کا 'اسلامی' ہونا ثابت ہوتا ہے، اس بارے میں عام اور بے قید ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں، یا حقیقت واقعی اس کے خلاف ہے؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، اس کے سلسلے کی ساری ضروری تفصیلات ہمارے سامنے آ ہی چکی ہیں۔ ان سے حقیقتِ واقعی قطعاً یہ نہیں معلوم ہوتی کہ جماعتی زندگی بھی اسلام کو مطلوب ہے، بلکہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اصلاً صرف جماعتی زندگی ہی اسے مطلوب ہے۔ وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ 'عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ' (جماعتی زندگی کو لازم پکڑو) بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ 'إِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ' (افتراق اور علیحدگی سے پوری طرح دور رہو) اور یہ کہ

اِنَّمَا یَاکُلُ الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ اَلْقَاصِیَۃَ (گلّے سے دور اور الگ ہو جانے والی ہی بکری بھیڑیے کا لقمہ بنا کرتی ہے) اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں لیا جا سکتا کہ شریعت نے جماعتی زندگی بسر کرنے کی جو ہدایت دی ہے اس کی تعمیل اختیاری نہیں بلکہ لازمی ہے۔

رہی دوسری بات، تو نہ تو انسان کے پیدا کئے جانے کی غرض و غایت ہی گوشہ گیری کے رویّے سے میل کھاتی ہے، نہ امّت مسلمہ کا مقصد وجود ہی اسے گوارا کرتا ہے ــ انسان کے پیدا کئے جانے کی غرض و غایت قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کی خلافت، اور اس کی 'عبادت' بتائی ہے۔ اگر گوشہ گیری کی زندگی بھی منظم اجتماعی زندگی ہی کی طرح علی الاطلاق اسلامی زندگی ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کا اختیار کرنا کسی حال میں بھی اور کسی شخص کے لئے بھی غلط نہیں ہو سکتا، ہر مسلمان اسے اختیار کر سکتا ہے، ہر فردِ ملّت کو اس کی ترغیب دی جا سکتی ہے، بلکہ یوں کہیئے کہ تاکید کی جا سکتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم منطقی طور پر ایک ایسی حالت کا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے، یا ایسی حالت بھی پسندیدہ اور مطلوب ہو سکتی ہے، جب کہ سارے مسلمان گوشوں میں جا بیٹھے ہوں۔ لیکن یہ صورت حال اگر وجود میں آجائے تو بجائے خود وہ چاہے جتنی بھی پسندیدہ ہو، اتنی بات تو بالکل قطعی ہے کہ اس کی موجودگی میں وہ غایت کبھی پوری نہ ہو سکے گی جس کیلئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی 'خلافت' کا فریضہ ادا ہونے کا کوئی عملی امکان ہی باقی نہ رہ جائے گا، اور اس کی 'عبادت'، اور غلامانہ اطاعت اس طرح کہیں بھی انجام نہ دی جا سکے گی جس طرح اسے انجام دیا جانا چاہیئے۔

اسی طرح امّت مسلمہ کا مقصدِ وجود، امر بالمعروف، شہادت حق، اور 'اقامت دین' ٹھیرایا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر امّت گوشوں میں معتکف ہو جاتی ہے تو وہ کسی وقت

بھی اپنے اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکے گی! آخر جہاں کوئی معاشرہ ہی نہ ہو وہاں 'امر بالمعروف' کے کتنے مواقع پیش آسکیں گے؟ 'حق کی شہادت' کس طرح دی جا سکے گی؟ اللہ کا دین کہاں اور کن لوگوں پر قائم کیا جا سکے گا؟

اب ان حدیثوں اور قرآنی اشارات کو لیجئے جن سے گوشہ گیری کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے: پہلی حدیث میں جہاں 'کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو جانے والے اور اپنے رب کی عبادت کرنے والے' کو ایک اونچے درجہ کا مومن بتایا گیا ہے، وہیں اس کے اندر دو باتیں اور بھی موجود ہیں:۔ ایک[۱] تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راہِ خدا میں اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والے مومن' اور 'کسی گھاٹی میں گوشہ نشین ہو جانے والے مومن' دونوں کا ذکر ایک ہی ساتھ نہیں فرمایا ہے، بلکہ پوچھنے والے کے اس سوال پر کہ "سب سے افضل انسان کون سا ہے؟" آپ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو رہے کہ "وہ مسلمان جو اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے"۔ اور جب اس نے دوبارہ پوچھا کہ "پھر کون؟"، تب دوسرے شخص کا تذکرہ فرمایا، اور وہ بھی "پھر" کے لفظ کی صراحت کے ساتھ۔ دوسری[۲] یہ کہ اس گوشہ نشینی کی ایک خاص ضرورت اور اس کا ایک خاص محرک ہونا چاہئے، اور وہ یہ کہ انسان 'دوسروں کو اپنے شر سے' یا 'اپنے آپ کو دوسروں کے شر سے' بچانا چاہتا ہو۔

یہی حال دوسری حدیث کا بھی ہے۔ اس میں بھی گوشہ گیری کی ترغیب کے ساتھ دو اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں:۔ ایک[۱] تو یہ کہ "لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے" دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کوئی غیر معمولی زمانہ ہوگا جس کے کچھ خاص حالات ہوں گے۔ دوسری[۲] یہ کہ جب ایسا زمانہ آئے گا تو 'خدا ترس لوگ اپنی بکریاں لے کر پہاڑوں اور گھاٹیوں میں اس لئے نکل جائیں گے'، یا انھیں اس لئے نکل جانا چاہیئے، تاکہ ان کا دین فتنوں سے محفوظ رہے۔

اسی طرح اصحابِ کہف کے جس واقعے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ قرآن حکیم گوشۂ تنہائی کی زندگی کو بھی پسندیدہ اسلامی زندگی قرار دیتا ہے، اس کی تفصیل میں یہ امور بھی موجود ہیں :- ایک تو یہ کہ ان حضرات کی تعداد چند سے زیادہ نہیں تھی، جب کہ ان کی پوری قوم مشرک تھی۔ دوسرے یہ کہ قوم کے سامنے انھوں نے اپنے ایمان کا علانیہ اظہار کیا، اسے توحید کی دعوت دی (إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ) نہ صرف دعوت دی، بلکہ اتمامِ حجت کی حد تک دعوت دی اور بحث و مناظرے میں اسے بند کر دیا (هٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ) تیسرے یہ کہ غار کو انھوں نے اپنی قیام گاہ نہیں بلکہ پناہ گاہ بنایا تھا، اور یہ پناہ بھی انھوں نے اس وقت لی تھی جب ان کی قوم انھیں برداشت کرنے سے انکار کر چکی تھی اور اب انھیں بستی میں ٹکے رہنے کے لئے اپنے ایمان اور اپنی جان میں سے ایک کی بھینٹ دینا ضروری ہو گیا تھا (إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ)

قرآن اور حدیث کے ان ارشادات کا یہ جائزہ صاف بتاتا ہے کہ ان سے گوشہ نشینی کا رویّہ اختیار کرنے کی جو ہدایت ملتی ہے، وہ عام اور بے قید ہرگز نہیں ہے بلکہ بعض قیدوں اور شرطوں کے ساتھ مقیّد ہے۔ کچھ خاص حالات ہیں جن کے اندر ہی اس رویّے پر عمل ہوا کرتا ہے۔ ایک دینی ضرورت، یا یوں کہئے کہ ایک بہت بڑی دینی مجبوری ہوتی ہے جس کے تحت مسلمان کو ادھر جانا پڑتا ہے۔

گوشہ گیری کی زندگی کس نوع کی 'اسلامی' زندگی ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے جن مختلف پہلوؤں سے غور و فکر ہونا چاہیئے تھا، ان سب پر ہم ضروری حد تک غور کر چکے ـــــ اس کی روشنی میں اس خیال کی قطعًا کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ گوشہ نشینی کی زندگی اور جماعتی زندگی، دونوں ہر حیثیت سے یکساں طور پر اسلامی زندگی

ہیں۔ اس کے برخلاف حقیقت واقعی یہ قرار پاتی ہے کہ اصل اسلامی زندگی صرف جماعتی زندگی ہے، اور بنیادی طور پر صرف وہی قابلِ اختیار ہے۔ رہی گوشوں کی زندگی، تو وہ اصل اسلامی زندگی ہرگز نہیں ہے، کہ اسے عام حالات میں اختیار کیا جاسکتا ہو۔ بلکہ وہ صرف 'عارضی' قسم کی اسلامی زندگی ہے، جسے بعض خاص حالات میں، اور انتہائی اہم مجبوری کے وقت ہی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ یہ 'خاص حالات' فتنہ وشر کے حالات ہیں، اور یہ 'انتہائی مجبوری' اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی مجبوری ہے۔ یعنی وہ جماعتی زندگی، جو مسلمان کو دراصل اپنے دینی تقاضے پورے کر سکنے اور اپنے ایمان کی نشوونما ہی کے لئے مطلوب ہوتی ہے، جب اپنی اس حیثیت سے بڑی حد تک محروم ہو جاتی ہے، اپنی یہ مطلوبہ افادیت کھو دیتی ہے اور دین و ایمان کے معاملے میں اُلٹا عمل کرنے لگتی ہے، تو وہ اُسے چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور بڑے قلق اور انتہائی حسرت کے ساتھ گوشوں والی زندگی گوارا کر لیتا ہے۔ جہاں انسانی تخلیق کی غرض وغایت، اور امتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود پورا کر سکنے کے مواقع ایک قابلِ لحاظ حد تک بالکل ناپید ہوتے ہیں، اور اللہ کی بندگی صرف ادھوری ہی کی جاسکتی ہے۔

غرض ایمان واسلام کا اصل وطن تو جماعتی زندگی ہی ہے اور جیسا چاہئیے وہیں یہ پروان چڑھ سکتے اور برگ و بار لا سکتے ہیں لیکن جب ان کا یہ وطن، انھیں اطمینان کا سانس نہیں لینے دیتا تو وہ مجبوراً 'سرزمین غیر' میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں، اور گوشوں میں جا کر مسافرت کی جیسی تیسی زندگی گذارے جانے کے سوا ان کے لئے کوئی اور چارہ نہیں رہ جاتا۔

صرف یہی نہیں کہ گوشہ گیری کی زندگی 'عارضی قسم کی اسلامی' زندگی ہے، بلکہ جماعتی زندگی کے مقابلے میں اس کا درجہ بھی 'ثانوی قسم' کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی زندگی کو

مجبوری کی وجہ سے اور دین و ایمان کے مفاد ہی میں اختیار کیا جاتا ہے، اور اس میں اپنی کسی کوتاہی کا دخل نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود امر واقعی یہی ہے اور یہ مجبوری' اور 'بے قصوری' اس طرز زندگی کو اصل اسلامی زندگی کا ہم پایہ نہیں بنا دے سکتی، نہ گوشوں میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرنے والا اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو اجتماعی زندگی میں رہ کر یہ فرض بجالاتا ہے۔ اس فرقِ مراتب کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ پہلے شخص کی عبادت، نماز روزے وغیرہ چند انفرادی اعمالِ بندگی تک محدود رہتی ہے، جب کہ دوسرے کی عبادت ان انفرادی اعمال سے شروع ہو کر جانی اور مالی جہاد فی سبیل اللہ جیسی آخری حدودِ بندگی تک وسیع ہوتی ہے۔ اس لئے حق یہی ہے کہ پہلے کا مرتبہ دوسرے سے فروتر ہو۔ یہ صرف عقل اور قیاس ہی کا فیصلہ نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشادات میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ پوچھنے والے نے جب پوچھا کہ "سب سے افضل انسان کون ہوتا ہے؟" تو آپؐ نے اس کے جواب میں 'اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والے مومن' اور کسی گھاٹی میں گوشہ نشین ہو کر اللہ کی عبادت کرنے والے مومن' دونوں کا ساتھ ساتھ تذکرہ نہیں فرمایا، بلکہ صرف پہلی قسم کے مومن کا ذکر کر کے خاموش ہو رہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں "سب سے افضل انسان" صرف اِسی طرح کے اہل ایمان ہوتے ہیں، کوئی دوسرا مومن ان کا ہم مرتبہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب دوبارہ پوچھا گیا کہ "پھر کون؟" تو ارشاد ہوا کہ "پھر وہ مومن جو کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو گیا ہو اور وہاں اپنے رب کی عبادت کرتا ہو۔ یہ پوچھنے والے کا "پھر" کا لفظ استعمال کرنا، اور آپؐ کی طرف سے جواب کا بھی اسی لفظ سے شروع ہونا اس حقیقت کو روشن سے روشن تر کر دیتا ہے کہ گوشہ نشینی کا مقام جماعتی زندگی کے مقابلے میں بہر حال فروتر اور ثانوی درجے کا ہے۔ شریعت کی

کی زبان میں اُسے یوں کہا جائے گا کہ گوشہ گیری کا راستہ 'رخصت' کا راستہ ہے 'عزیمت' کا نہیں۔ چنانچہ امام ابو داؤدؒ نے اپنی سنن میں گوشہ گیری سے متعلق حدیث بیان کرنے کے لئے باب ہی "الرخصہ فی التبدی فی الفتنۃ" کے عنوان سے قائم کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس طرزِ زندگی کے 'اسلامی' ہونے کے باوجود ہم کسی پیغمبر کا اسوہ اس کے حق میں نہیں پاتے۔ ہزاروں انبیاء میں سے کوئی نہ تھا جس نے کبھی اس روش کو اپنایا ہو۔ حالانکہ انھیں جس طرح کے سخت حالات سے سابقہ پیش آیا تھا، ہم اِس کا ٹھیک ٹھیک تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن چونکہ وہ اللہ کے نبی تھے، اس لئے ان کے لئے ایک ایسی روش اختیار کرنا ممکن نہ تھا جسے اختیار کرنے کے بعد وہ انسانی آبادیوں سے علیحدہ ہو رہتے اور جو عزیمت کی نہیں رخصت کی راہ تھی، اور یہ اس لئے کہ انسانی آبادیوں سے علیحدہ ہو جانے کے بعد تو وہ پیغمبری کا فریضہ ہی انجام نہیں دے سکتے تھے، اور رخصت کی راہ اپنانے کی ضرورت انھیں اس لئے نہیں پیش آسکتی تھی کہ 'لوگوں کو اپنے شر سے بچانے' یا 'اپنے (دین و ایمان) کو دوسروں کے شر سے محفوظ رکھنے' کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ رہی جان کے خطرے کی بات' تو یہ حضرات اپنی جان کو 'اپنی' سمجھتے ہی کب تھے کہ اسے بچانے کے لئے وقت کے جبّاروں سے دُور بھاگنے کے ضرورت مند ہوتے۔

حالات و شرائط

اب یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ وہ کون سے مخصوص حالات ہیں جن میں شریعت نے رخصت کی یہ راہ اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے؟ جہاں تک اس سوال کے اصولی جواب کا تعلق ہے وہ تو اوپر کی بحث میں واضح طور پر موجود ہے، اور وہ یہ کہ اسلام کی مطلوبہ اجتماعی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جانے کی ہدایت یا رخصت صرف اس وقت ہے جب معاشرہ 'شر' اور 'فتنہ' کی لپیٹ میں آگیا ہو، اور صرف اس شخص کو ہے جو اس شر اور فتنے

سے اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لئے ایسا کرنا ضروری سمجھتا ہو۔ چنانچہ دوسری حدیث کے الفاظ "یَفِرُّ بِدِیْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ" صاف اسی حقیقت کی نشان دہی کر رہے ہیں۔
اسی طرح پہلی حدیث کے بارے میں بھی علماء نے صراحت کی ہے کہ اس میں "کسی گھاٹی میں جاکر گوشہ نشین ہو جانے کی جو بات فرمائی گئی ہے اس کا تعلق صرف فتنوں کے زمانے سے ہے (وھو مقید بوقوع الفتن، فتح الباری جلد ۶) اور خود حدیث کے آخری الفاظ "یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهٖ" سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس مجمل اور اصولی جواب سے بات غالباً پوری طرح واضح نہ ہو سکے گی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس 'فتنے' اور 'شر' کی نوعیت متعین کی جائے جس کا ان حدیثوں میں ذکر ہے، اور معلوم کیا جائے کہ اس سے کس قسم کا فتنہ و شر مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد مطلق فتنہ و شر تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ اس معنی کے لحاظ سے تو دنیا کا کوئی زمانہ بھی فتنے اور شر سے خالی نہ تھا، حتیٰ کہ خود دورِ نبوت اور دورِ خلفائے راشدین بھی بے فتنہ و بے شر نہ تھے۔ کیونکہ ان دنوں بھی کم از کم نفاق کے فتنے تو موجود ہی تھے، اور باہمی اختلافات کے خوں ریز ہنگامے سر اٹھاتے رہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ 'فتنہ و شر' جس میں مومن کو اجتماعی زندگی سے اور اس کی ذمہ داریوں سے الگ ہو کر صرف اپنی ہی فکر میں لگ جانے کی رخصت دی گئی ہے، لازمی غیر معمولی قسم کا فتنہ و شر ہے۔ کس حد تک اور کس قسم کا غیر معمولی؟ اس امر کی وضاحت کے لئے مذکورہ احادیث کے اِن جملوں پر پھر سے اور گہری نظر ڈالئے:۔ یَفِرُّ بِدِیْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ" "یَعْتَزِلُ شُرُوْرَ النَّاسِ" "یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهٖ"، یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ 'شر' اور 'فتنے' سے مراد معاشرے کے ایسے سخت ابتر حالات ہیں جن کے اندر مسلمان اپنی ساری حفاظتی تدبیروں کے باوجود اپنے دین و ایمان کو محفوظ نہ پاتا ہو، اور شر و باطل کے بڑھتے ہوئے زبردست دباؤ میں ان کا

مستقبل اسے تاریک دکھائی دیتا ہو، اس حد تک تاریک کہ اب دوسروں کی برائیاں اس کے دل و دماغ پر بھی اثر ڈال دیں گی، اور وہ بھی ماحول کی نجاستوں میں لت پت ہو رہے گا، اور کچھ بعید نہیں کہ کل وہ خود ہی بُرائی کا پرچارک اور فتنہ و شر کا علم بردار بن جائے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر حالات ایسے خراب نہ ہوں، کہ دین و ایمان کے حق میں انھیں اتنا خطرناک کہا جا سکے، تو پھر اس رخصت پر عمل کرنا صحیح نہ ہو گا، اور ایسی شکل میں مومن کو اس بات کی اجازت نہ ہو گی کہ وہ جماعتی زندگی سے علیٰحدہ ہو جائے، ملّی نظم و اجتماعیت کے مطالبات سے منہ موڑ لے، صرف اپنی ہی ذات سے واسطہ رکھے، اور ملّت کو اپنے حال پر چھوڑ دے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی اجتماعی حیثیت بھی کھوتی چلی جائے، اور اس کی راکھ کے اندر خیر و صلاح کی جو چنگاریاں دبی دبائی موجود ہوں وہ بھی روز بروز بجھتی چلی جائیں، اور اس طرح وہ اپنے مقصد وجود سے عملاً دور سے دور ہوتی چلی جائے۔ ہاں اُس رخصت پر عمل اُس وقت ضرور قابلِ گوارا ہو سکتا ہے جب ملت میں مطلوبہ نظمِ اجتماعی بالفعل موجود ہو، اور معاشرے میں خیر غالب ہو۔ ایسی حالت میں اگر کچھ لوگ اپنے مخصوص ذوق کی بنا پر گوشوں میں جا بیٹھیں، اور باہر کی دنیا سے بے تعلق ہو رہیں، تو کہا جا سکے گا کہ ملّت بحیثیت مجموعی اپنا فرض پورا کر رہی ہے اور اس کی بہت بڑی اکثریت اس کی خدمت اور پاسبانی میں لگی ہوئی ہے، اس لئے کوئی مضائقہ نہیں اگر کچھ لوگ گوشہ نشین ہو گئے اور اپنی ہی ذات تک اپنی تربیتی اور دینی کوششیں محدود کر بیٹھے ہیں، اگرچہ پھر بھی اتنی بات تو لازماً کہی جائے گی کہ انھوں نے ایک زیادہ اچھے کام کو چھوڑ کر کم اچھے کام پر قناعت کر لی ہے ـــــ لیکن اگر ملّت اس حال میں نہ ہو، اگر وہ اپنا جماعتی نظم کھوتی جا رہی ہو، اگر مومن 'الجماعۃ' سے بھیڑ بنتے جا رہے ہوں، اگر مسلم معاشرے کا اجتماعی رُخ اسلام کے بجائے کسی اور طرف ہو چلا ہو، مختصر یہ کہ صحیح اسلامی نظامِ اجتماعی اگر کارفرما

باقی نہ رہ گیا ہو تو کسی واقعی خطرۂ دین کے بغیر گوشہ گیر ہو جانا اور ملت کی اجتماعی زندگی کو سسکتا چھوڑ دینا ہرگز اسلامی طرزِ بندگی اور دینی طریقِ زندگی نہیں۔

عمل کی صورتیں

آخر میں ایک اور مسئلہ وضاحت طلب رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ 'گوشہ گیری' کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اور 'اعتزال' (اجتماعی زندگی سے علیحدگی) کی جس روش کے اختیار کرنے کی رخصت شریعت نے دی ہے، اس کی حدود کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کسی ایک ہی صورت کا نام نہیں لیا جاسکتا کیونکہ اس کا انحصار تمام تر حالات پر ہے، جو ہر شخص کے لئے، اور ہر زمانے میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کے دین و ایمان کے لئے حالات جس حد تک ناسازگار اور خطرناک ہوں گے، اسی کی مناسبت سے اسے گوشہ نشینی اور 'اعتزال' کی شکل بھی اختیار کرنی ہوگی، مثلاً:۔

یہ حالات اگر خدانخواستہ، ابتری کی اس حد کو پہنچ گئے ہوں کہ دین کے بنیادی اصولوں پر بھی قائم رہنا دشوار ہو چکا ہو، اور اس کی بنیادی تعلیمات کا اعلان و اظہار بھی برداشت نہ کیا جاتا ہو، تو اس وقت گوشہ گیری کے انتہائی مفہوم اور اس کی آخری شکل کو اختیار کیا جائے گا۔ جس کی مثال اصحاب کہف کے اُسوے میں موجود ہے۔ انھوں نے مکمل علیحدگی اور غار نشینی اس وقت اختیار کی تھی جب ان کے لئے اپنی بستی کے اندر کلمۂ حق کہنے کی اجازت باقی نہ رہ گئی تھی اور انھیں یقین سا ہو گیا تھا کہ اب دعوتِ حق لوگوں کے سامنے ہماری زبانوں سے نکلی نہیں کہ ہم پر پتھروں کی بارش ہو جائے گی۔

اور اگر حالات اتنے خطرناک نہ ہوئے ہوں تو اُس وقت گوشہ گیری اور علیحدگی کی جو شکل اپنائی جائے گی، وہ ایسی نہ ہوگی، بلکہ اس سے بہرحال کمتر درجے کی ہوگی یعنی کچھ اس طرح کہ انسان آبادی کو یک قلم تو نہ چھوڑے، مگر عام اجتماعی معاملات سے الگ ہو جائے

فتنے کے علم برداروں کو اپنے حال پر چھوڑ دے، اور ان کی بھڑکائی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے ہاتھ اور زبان کی کوششوں کے بجائے صرف دل سے بُرا ماننے پر اکتفا کرلے۔ بس اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی کے لئے کوئی جائز ذریعۂ معاش، جو بہر حال معمولی قسم ہی کا ہوسکتا ہے، اختیار کرلے اور اپنی آخرت کی فکر میں لگ جائے، نماز اور روزے، حج اور زکوٰۃ کا اہتمام رکھے، اور عام انسانوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کرتا رہے۔

جہاں تک عام اندازے کا تعلق ہے، ایک بدتر سے بدتر مسلم معاشرے میں بھی جس خراب صورت حال کا اندیشہ کیا جاسکتا ہے، وہ بس اسی قسم کی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ خود ان حدیثوں میں، جن کے اندر اس اعتزال، اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کی رخصت یا ہدایت دی گئی ہے، نماز کی اقامت اور اللہ کی عبادت کے ساتھ ادائے زکوٰۃ کا حکم بھی موجود ہے، یہ حکم صاف طور سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کی ادائی اسی وقت عمل میں آسکتی ہے جب دوسرے انسانوں سے ربط و تعلق کچھ نہ کچھ باقی ہو۔ غاروں اور گپھاؤں میں تو اس کی کوئی عملی شکل ممکن ہی نہ رہے گی۔

فیصلے میں احتیاط کی ضرورت

آخر میں اس اہم ترین حقیقت کا یاد دلا دینا بھی ضروری ہے کہ 'حالات' کی نزاکت اور خطرناکی کا درجہ متعین کرنے میں بڑی سخت احتیاط اور انتہائی بے لاگ جائزے سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ انسانی فطرت کے دو رجحانات ایسے ہیں جو اس معاملے میں صحیح فیصلے تک پہنچنے میں زبردست روک بن سکتے ہیں، اور بنتے رہے ہیں۔

ایک تو گوشہ نشینی کا رجحان، دوسرا تن آسانی کا رجحان۔ اس لئے اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ کوئی شخص ان میں سے کسی رجحان کی بنا پر گوشہ گیری کی طرف بذات خود مائل ہوجائے، اور اپنی اسی ذاتی میلان کے زیرِ اثر حالات کی خطرناکی کا اندازہ کرنے میں مبالغہ

کر بیٹھے، اور انھیں اپنے دین وایمان کے حق میں اتنا خطرناک سمجھ لے کہ جتنا وہ فی الواقع نہ ہوں اور پھر گوشہ نشینی کے بارے میں وارد ہونے والی حدیثوں کو اپنے لئے ایک سہارا بنا کر ملی تنظیم اور جماعتی زندگی سے الگ ہو جائے یا اگر یہ تنظیم اور اجتماعیت موجود نہ ہو تو اسے از سرِ نو قائم کرنے کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد قرار دے لے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ فیصلہ دراصل اپنے ذاتی ذوق ورجحان کی تسکین کے لئے ہوگا، احادیثِ رسولؐ کی پیروی کے لئے نہ ہوگا۔

ایک مومن کی حقیقی پسند اور اس کی آخری کوشش تو اس بارے میں یہ ہونی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو، اجتماعیت سے چمٹا رہے، اور اس کی بقا و ترقی یا بحالی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے، اور اس سے علیحدگی کی اُسی وقت سوچے جب وہ اس کے دین ایمان کے لئے فی الواقع کھلے ہوئے خطرے کی شکل اختیار کر چکی ہو۔ اور اس وقت بھی اس کی یہ علیحدگی کسی احساسِ پسندیدگی کے ساتھ نہ ہونی چاہیئے، کیونکہ اسلام نے دین اور دین داری کا جو تصور دیا ہے، اس کی رو سے یہ فی الواقع کوئی پسند کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اجتماعی زندگی کو چھوڑ دینا کچھ بڑھے ہوئے ناخنوں کو تراش پھینکنا نہیں ہے، کہ اس سے راحت محسوس کی جائے، بلکہ گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا ہے جس کی اذیت اُٹھانے کے لئے کوئی ذی شعور اپنی خوشی سے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔

کاتب۔ عبداللہ